POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 January 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI ZABAN (Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 09-01-2026 • Price: 5/- • 15-21 January 2026 • Issue: 3 • Vol:85

۱۵تا۲۱جنوری ۲۰۲۶ء • شمارہ:۳ • جلد:۸۵

کلامِ شبلی کے منظوم تراجم

محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی نعمانی (1857-1914) اردو و فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ دونوں زبانوں میں دادِ سخن دیتے تھے۔ دونوں زبانوں میں ان کا کلیات شائع ہوا ہے۔ ان کی اشاعت سے پہلے بلکہ ان کی زندگی میں اردو اور فارسی نظموں اور غزلوں کے متعدد مجموعہ ہائے کلام (نظم شبلی، دیوانِ شبلی، کلامِ شبلی، دستۂ گل، بوئے گل اور بعد از وفات برگِ گل) شائع ہوکر مقبول ہو چکے تھے۔

راقم نے کلامِ شبلی کے اعلام و اشخاص پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو 2019 میں شائع ہوئی۔ زیرِ نظر مقالے میں ان کے کلام کے تراجم اور مترجمین کا ذکر مقصود ہے، جو اگرچہ بہت زیادہ نہیں ہے تاہم جو کچھ ہے وہ قابلِ ذکر ہے۔

علامہ شبلی جس بلند پایے کے شاعر تھے خاص طور پر ان کی فارسی شاعری جس قدر بلند درجے کی ہے اس قدر ان کے کلام کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا، بلکہ ہمارے ادبا کا ایک بڑا طبقہ عرصے تک انھیں شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا تھا اور نثر نگاروں خاص طور پر سیرت و سوانح نگاروں کے ذیل میں ان کا ذکر کر کے گزر جاتا تھا۔ ادیبوں اور نقادوں کا یہ رویّہ ان کی شاعری کی تفہیم میں رکاوٹ بنا، تاہم اب ان کا بڑے پیمانے پر مطالعہ و جائزہ لیا جاچکا ہے بلکہ ان کی شاعری پر کئی کتابیں اور تحقیقی مقالے قلم بند کیے جاچکے ہیں۔

1- مولانا ظفر علی خاں

علامہ شبلی کے کلام کے ترجمے کی جانب ان کے شاگرد، مشہور مجاہدِ آزادی اور ممتاز ادیب و شاعر مولانا ظفر علی خاں (1873-1956) ایڈیٹر 'زمیندار' لاہور نے جنھیں اردو ادبیات ہی کی طرح انگریزی ادبیات پر بھی عبور حاصل تھا، سب سے پہلے توجہ دی اور ان کی مشہور نظم 'ہم کشتگان معرکۂ کان پور ہیں' کا انگریزی ترجمہ کیا۔ یہاں پہلے علامہ شبلی کی نظم، پھر مولانا ظفر علی خاں کا انگریزی ترجمہ نقل کیا جاتا ہے:

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جاکے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خُرد سال ہیں جو چپ ہیں خودمگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظرِ نفخِ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشہ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل وشعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
سینے پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار
از بسکہ مست بادۂ ناز وغرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے جوسر
لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جوخاک وخون میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جومیں نے کون ہوتم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکۂ کان پور ہیں

(کلیاتِ شبلی اردو)

انگریزی ترجمہ:

I saw some lifeless bodies yesterday,
All pierced through with gaping wounds were they.
And some were children silent as the tomb,
Their tender years reproached their tragic doom.
''We came to build the House of God on high,
But feeling drowsy slept, they seemed to sigh"
"And now we wait till Israfil shall sound,
His clarion which will bring senses round"
And some were young, even in the prime of life,
Versed in world`s ways, skilled in stress and strife.
Their singing youth in tones of burning pride,
Confessed the guilt which weakness strove to chide.
Their haughty valour made their brawny breast,
A living shield for lance set in rest.
Their eager souls forestalled their ghostly fate,
Their right hands cut their throats, they scorned to wait.
And some were old men here not with rage and toil,
Who moved to shuffle off this mortal coil.
And as they rolled in dust and blood it seemed,
A halo round their beaming bodies gleamed.
I said "who are you" and could say no more,
A voice replied, "The victims of Cawnpore".(1)

(مرغزار، ظفر علی خاں نمبر، شیخو پورہ گورنمنٹ کالج، 1981، ص288، بحوالہ بازیافت (27) شعبۂ اردو اورینٹل کالج لاہور ص123-24)

علامہ شبلی کی اس نظم کے علاوہ ان کی کسی اور تخلیق (نظم یا دیگر اصناف) کے انگریزی ترجمے کا ذکر نہیں ملتا اور راقم کے تلاشِ بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ البتہ علامہ شبلی کے فارسی کلام کے مترجمین نے ان کی فارسی غزلوں کے منظوم اردو تراجم بڑے اہتمام سے شائع کیے ہیں۔

2- اکبر علی خاں عرشی زادہ

اکبر علی خاں عرشی زادہ (1940-1997) مشہور محقق، نامور ادیب اور ماہرِ غالبیات مولانا امتیاز علی خاں عرشی (1904-1981) کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ادیب، شاعر اور محقق و نقاد تھے۔ ان کا شمار بجاطور پر غالب شناسوں میں ہوتا ہے۔ اس سلسلے کا ان کا اہم کارنامہ دیوانِ غالب کا فارسی سے انگریزی میں ترجمہ ہے، جس پر انھیں انعام سے نوازا گیا۔ قاعدۂ عرشی زادہ بھی ان کی ایک کاوش ہے جو انھوں نے اردو سے ناواقف لوگوں کے لیے تیار کیا تھا۔

عرشی زادہ 27 جولائی 1940 کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارسی میں ایم، اے کرنے کے بعد 1961 میں رام پور رضا لائبریری سے وابستہ ہوئے اور ترقی کر کے ایڈیشنل ڈائرکٹر ہوئے۔ اسی عہدے پر کام کرتے ہوئے 16 اکتوبر 1997 کو لائبریری ہی میں انتقال کیا۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ علامہ شبلی نعمانی کے شیدائیوں میں تھے۔ 1978 میں ماہنامہ 'تحریک' دہلی کے سلور جبلی نمبر کے لیے انھوں نے علامہ شبلی کے مجموعۂ غزلیات دستۂ گل، بوئے گل اور برگِ گل کی 26 منتخب غزلوں اور ایک خیر مقدم کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ علامہ شبلی کو یہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا اور منفرد خراجِ عقیدت تھا۔

اس ترجمے میں مترجم نے اصل متن کے بہت قریب رہنے کی کوشش کی ہے، حتیٰ کے الفاظ ہی نہیں بلکہ آدھے آدھے مصرعے جوں

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کرسکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

کے توں ترجمے میں موجود ہیں۔ فارسی نہ جاننے والوں کو ترجمے کے بعد بھی سمجھنا مشکل ہوگا، تاہم یہ ایک بڑی کوشش تھی، جسے سراہا گیا۔ عرشی زادہ کے نام ایک خط میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''شبلی کا ترجمہ آپ نے اسی کیفیت میں کیا ہے جو اصل کلام میں ہے۔ آپ کی شخصیت میں بھی وہی رومانیت موجود ہے، جس کی وجہ سے شبلی بدنام رہے۔ خیر اُن کو تو عالمِ دین ہونے کی لاج رکھنی تھی آپ تو اس رومانیت کو زندہ رکھیں۔ آپ کی تحریروں میں جان اسی وجہ سے ہے۔''

(ماہنامہ 'تحریک' دہلی، سلور جبلی نمبر، ص598)

اسے اسی اہتمام سے پیش کرنا چاہیے تھا جس طرح پیش کیا گیا ہے مگر فاضل مترجم نے ڈاکٹر وحید قریشی کی طرح شبلی کی غزلوں میں جس معشوق کا ذکر ہے، اسے قطعی طور پر عطیہ فیضی تصور کرلیا ہے۔ یہ ایک شاعر کے ساتھ اس لیے بے جا اور ناانصافی ہے کہ اس سے پہلے کسی شاعر کے ساتھ یہ رویّہ روا نہیں رکھا گیا۔ وحید قریشی کی کتاب 'شبلی کی حیاتِ معاشقہ' 1950 میں شایع ہوئی تھی۔ 1960 میں ڈاکٹر ابنِ فرید نے ماہنامہ 'ادیب' کے شبلی نمبر میں اس کا مفصل تحقیقی اور معروضی جائزہ لیا، جس سے خود قریشی صاحب نے اتفاق کیا بلکہ بعد میں اپنی کتاب سے بیزاری کا اعلان کردیا۔ (روشنائی کراچی نمبر 33، اپریل - جون 2008، ص175)۔ حتیٰ کہ لاہور اور اس کے قرب و جوار کے کتب خانوں سے اسے غائب کرادیا تھا۔

(عرفان احمد، شبلی کی حیاتِ معاشقہ، ص6، طبعِ دوم، لاہور 2009)

تعجب ہے کہ 18 سال بعد علامہ شبلی کو پھر اسی رنگ میں کیوں کر دیکھا گیا۔ ایڈیٹر 'تحریک' گوپال متّل نے بڑے زوردار انداز میں اس کی ایک وجہ بتائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''عبدالحمید عدم دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں تہران میں متعین تھے۔ اس زمانے کی انھوں نے مجھے ایک دلچسپ بات بتائی۔ ایک شام ایک ایرانی نے عدم صاحب کے ایک دوست کو جو متقی و پرہیزگار تھا، شام کے کھانے پر بلایا۔ کھانے سے پہلے میزبان نے ساغرِ مئے مہمان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا 'آقا عرق بخور' مہمان نے انگریزی میں جواب دیا no, no , i am muslim میزبان نے اس پر مسکرا کر کہا 'ولے آدم نیستی'۔

ولے آدم نیستی بظاہر ایک سادہ سا فقرہ ہے، لیکن اس میں ایک جہانِ معنیٰ آباد ہے۔ اردو والوں کے لیے تو اس کا مفہوم سمجھنا خاص طور پر ضروری ہے، کیوں کہ عام روش یہ ہے کہ علمی دنیا میں اگر کسی شخص کو ممتاز مقام حاصل ہوجائے اور اس کا کچھ دینی مرتبہ بھی ہو تو اسے ہم فرشتہ سمجھ لیتے ہیں اور یہ قیاس کرلیتے ہیں کہ اس کا دل عام انسانی جذبات سے عاری ہے۔ یہ بھول کر کہ اگر دل زندہ ہے تو کہیں نہ کہیں بہکے گا ضرور۔

شبلی کی علمی اور دینی حیثیت مسلمات کا درجہ رکھتی ہے لیکن وہ صاحبِ دل تھے۔ یہ قصہ مختصراً دوسرے لوگوں نے بھی بیان کیا ہے، لیکن یہ داستان شبلی کی کچھ تحریروں اور ان کی فارسی غزلوں میں خود ان کی زبانی بیان ہوئی ہے۔''

(ماہنامہ 'تحریک'، دہلی، سلور جبلی نمبر، جولائی - اکتوبر 1978، ص578)

ان کے تعارف کا دوسرا حصہ قابلِ تحسین ہے، جس میں انھوں نے عرشی زادہ کی ستائش کی اور لکھا:

''اکبر علی خاں عرشی زادہ نے 'عطیہ شبلی' کے عنوان سے شبلی کی ان غزلوں کی منظوم ترجمانی کرکے اردو والوں پر واقعی احسان کیا ہے۔ یہ کام آسان نہیں تھا، لیکن عرشی زادہ اس مشکل کام سے جس کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں، اس کا اندازہ وہ لوگ بخوبی لگا سکتے ہیں جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں سے واقف ہیں۔ ابتدا میں عرشی زادہ نے شبلی کے دو خطوط کا حوالہ دیا ہے اور مولانا حالی کا ایک خط بھی نقل کیا ہے، جو انھوں نے یہ غزلیں پڑھ کر شبلی کو لکھا تھا، غزلوں کے اس مجموعے کو عرشی زادہ نے جو عنوان دیا ہے وہ خصوصیت سے دادطلب ہے۔ ویسے ایک لحاظ سے اسے 'عطیہ عطیہ' بھی کہا جاسکتا ہے۔ عطیہ بیگم کے اردو پر اور بھی احسانات ہیں، جب اقبال دل شکستہ ہوکر شاعری سے دستکش ہونے والے تھے تو اس شغل کو جاری رکھنے کے لیے عطیہ بیگم ہی نے ان کا دل بڑھایا۔

امید ہے کہ قارئین عرشی زادہ کے اس کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ عرشی زادہ تو داد کے مستحق ہیں ہی، تھوڑی بہت داد کا مستحق راقم الحروف بھی ہے، جس نے عرشی زادہ کی تمام مصروفیتوں کے باوجود انھیں یہ کام کرنے پر آمادہ کیا۔''

(ماہنامہ 'تحریک' دہلی، سلور جبلی نمبر، جولائی - اکتوبر 1978، ص578)

عرشی زداہ مرحوم کی یہ کاوش اپنے اندر بڑی معنویت رکھتی ہے، تاہم یہ ترجمہ دراصل ان کی شبلی شناسی اور ان کے نقطۂ نظر کا ترجمان ہے، اس لیے یہاں بطورِ نمونہ علامہ شبلی کی تین فارسی غزلوں کے ساتھ عرشی زادہ کا منظوم اردو ترجمہ بھی درج کیا جاتا ہے۔

(1)

شبلی-ستمبر 1906	عرشی زادہ
چند بے ہودہ بہ بندِ غم دنیا باشم	کب تک آلودہ فکرِ غم دنیا رہیے
زیں سپس با قدح و بادہ و مینا باشم	آج سے مست قدح نوشی صہبا رہیے
جبہ سائے حرم کعبہ چو بودم یک چند	مدتوں طوفِ حرم کرتے رہے ہیں، کچھ دیر
بر در بتکدہ ہم ناصیہ فرسا باشم	درِ بت خانہ پہ بھی ناصیہ فرسا رہیے
گرچہ رندی و ہوس شیوۂ دانا نہ بود	گرچہ رندی و ہوس شیوۂ فرزانہ نہیں
حاجتم نیست کہ فرزانہ و دانا باشم	کیا ضروری ہے کہ فرزانہ و دانا رہیے
بادہ ہر چند تہ خرقہ تواں نیز کشید	بادہ ہر چند تہ خرقہ بھی پی سکتے تھے
نرگس مست کسے خواست کہ رسوا باشم	چشمِ ساقی کا مگر حکم ہے رسوا رہیے
مست و برعربدہ تنکش بکشم در آغوش	کیسے مستانہ اسے تنگ در آغوش نہ لیں
تشنۂ وصلم و تا کے بحابا باشم	تشنۂ وصل میں تا کے بحابا رہیے
باہمہ دعوی تمکیں نہ تواں خواست زمن	ہے یہ مشکل بہمہ دعوی تمکین و شکیب
کہ تو از پردہ بدر آئی و برجا باشم	کہ وہ بے پردہ ہو اور آپ بھی برجا رہیے
جلوہ او نگذارد کہ برم بہرہ ز وصل	وصل سے بڑھ کے ہیں وہ جلوے جو دل کہتا ہے
بد مد صبح و ہماں محو تماشا باشم	لاکھ ہو جائے سحر محوِ تماشا رہیے
محتسب دست بداماں من و من سرمست	محتسب دست بداماں ہو مگر خود سرمست
دست در دامن محبوب خود آرا باشم	دست در دامنِ محبوب خود آرا رہیے
دامن عیش زدستم نہ رود تا شبلی	دامنِ بمبئی ہاتھوں میں ہے جب تک شبلی
دامن بمبئی از کفِ ندہم تا باشم	دامنِ عیش نہ چھوٹے گا شکیبا رہیے

(2)

شبلی-ستمبر 1906	عرشی زادہ
نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را	نثارِ بمبئی کیجیے متاعِ کہنہ و نو کو
طراز مسند جمشید و تاج فرخسر را	طراز مسندِ جمشید و فر تاج خسرو کو
بہ ہر سو از ہجوم دلبران شوخ بے پروا	ہجوم دلبران شوخ بے پرواہے وہ ہر سو
گذشتن از سرِ رہ مشکل افتادست رہروا	گزرنا راستوں سے ہوگیا دشوار رہرو کو
فغاں از گرمی ہنگامہ خوباں زردشتی	غضب ہے گرمیِ ہنگامہ خوباں زردشتی
بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را	کیا ہے زلف و عارض میں بہم کیا ظلمت وضو کو
بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت	پلا ساقی، مے باقی کہ جنت میں نہ پائے گا
کنار آب چوپاٹی و گل گشت اپالو را	کنار آب چوپاٹی و گل گشت اپالو کو
بیا شبلی بہ یاد پنجہ گیرائے مژگانش	مناسب ہے یہی شبلی بیادِ پنجۂ مژگاں
دگر رہ پارہ سازم ایں قبائے زہد صدتو را	کریں پھر پارہ پارہ ہم قبائے زہد صدتو کو

(3)

شبلی-ستمبر 1906	عرشی زادہ
غمزہ اش طرح نہد رسم جفا کوشی را	اس کے غمزوں نے کیا زندہ جفا کوشی کو
جلوہ، یادت دہد، از خویش فراموشی را	تازگی جلووں نے دی خویش فراموشی کو
بنگر معجزۂ حسن کہ آں نرگس مست	دیکھیے معجزۂ حسن کہ وہ نرگسِ مست
بہم آمیختہ ہشیاری و مدہوشی را	کیا بہم کرگئی ہشیاری و مدہوشی کو
من فدائے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال	اس بتِ شوخ پہ مرتا ہوں کہ جس نے دم وصل
بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را	خود سکھایا مجھے آئین ہم آغوشی کو
مے بانداز زدن گررہ و رسمی است قدیم	مے کشی وہ بھی باندازۂ پیمانہ و جام
طرح نو درفگن آئین قدح نوشی را	رنگِ نو دیجیے آدابِ قدح نوشی کو
شبلی نامہ سیہ گرچہ سراپا گنہ ست	شبلی نامہ سیہ گرچہ سراپا ہے گناہ
بس بود دامن عفو تو خطا پوشی را	دامنِ عفو بھی کیا کم ہے خطا پوشی کو

3- حکیم آزادانصاری

مشہور شاعر و ادیب علامہ حکیم آزاد انصاری کے مجموعۂ کلام 'معارفِ جمیل' کی غزل کا ایک شعر ہے۔

نثار اس شوخ کے جس نے شبِ وصل
خود آئین ہم آغوشی سکھایا

(معارفِ جمیل، ص219)

اس پر خود شاعر حکیم آزاد انصاری نے یہ نوٹ لگایا ہے کہ ''یہ شعر علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے حسبِ ذیل مشہور فارسی شعر کا ترجمہ ہے۔

من فدائے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال
بہ من آموخت خود آئین ہم آغوشی را

(معارفِ جمیل، ص219)

اس ترجمے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فارسی دانوں میں علامہ شبلی کی فارسی شاعری کس درجہ مقبول اور دلچسپی کا باعث تھی۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ نے علامہ شبلی کی جن فارسی غزلوں کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے اس میں وہ غزل بھی شامل ہے، اس کے ایک شعر کا عرشی زادہ کا ترجمہ یہ ہے:

اس بت شوخ پہ مرتا ہوں کہ جس نے دم وصل
خود سکھایا مجھے آئین ہم آغوشی کو

(شبلی سخنوروں کی نظر میں، ص244)

دونوں تراجم کے موازنے سے واضح ہوتا ہے کہ اکبر علی خاں عرشی زادہ کا منظوم ترجمہ حکیم آزاد انصاری کے مقابلے میں اصل شعر کے زیادہ قریب ہے۔

4- ڈاکٹر احمدعلی برقی اعظمی

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی (1954-2022) فارسی شعر و ادب پر بڑی دسترس اور گہری نگاہ رکھتے تھے۔ فارسی ادبیات میں انھوں نے پی ایچ.ڈی کی تھی، اس کے لیے انھوں نے افغانستان و ایران کی سیاحت بھی کی تھی اور اپنے عہد کے فارسی ادب کے نمائندہ ادبا و شعرا سے ملاقات کی تھی، حتیٰ کہ مرحوم شعرائے عجم کے مزارات کی زیارت بھی۔

ڈاکٹر احمد علی برقی ضلع اعظم گڑھ کے محلّہ باز بہادر میں 25 دسمبر 1954 کو پیدا ہوئے اور 5 دسمبر 2022 کو وفات پائی۔ اعظم گڑھ میں سپردِ خاک ہوئے۔ پوری زندگی آل انڈیا ریڈیو دہلی ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

نظم کے پانچ رنگ

غضنفر اقبال

اردو سخنوری کی روایت میں نظم جدید اذہان کی اختراع ہے۔ نظم نغمگی، محاکات اور ماورائے سخن ہے یہ صنف وسیع تر ذہنی تخیل اور جذباتی فضا میں داخل کرنے کا وسیلہ ہے اور لمحہ بہ لمحہ ظاہری مگر بے پناہ وسعتوں میں لپٹی ہوئی کائنات سے متصادم ہے۔ راقم تحریر نے عہدِ موجود کے معاصر نظم کے منظرنامے میں فرحان حنیف وارثی، برجیش عنبر، شہرام سرمدی، صابر، اور عادل رضا منصوری کی سنجیدہ نظمیہ کاوشوں کو مطالعے کا خصوصی موضوع بنایا ہے۔ خاطر نشاں رہے کہ یہ تحریر مذکورہ نظم گو شعرا کا تقابلی جائزہ نہیں بلکہ اُن کی نظم نگاری کا تعارفی جائزہ پیش کرنے کی ایک ادنا سی کوشش ہے۔

زیرِ مطالعہ نظم نگار شعرا نے نظم کو وسعت بخشی ہے اور ذہنی انجماد پر مہمیز کا کام کیا ہے۔ ان کی نظموں میں انفرادیت کے نقوش اور وسعتوں کے نئے نشانات نمایاں ہوئے ہیں۔ پانچ منتخب شعرا کے تجربات کی زمین ان کی زائیدہ فضا میں پروان چڑھی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ نظم گوئی واقعی ایک مشکل ترین صنفِ سخن ہے اور یہ صنف صبر آزما عہد سے گزر رہی ہے لیکن زیرِ مطالعہ نظم گو شعرا دھوپ چھاؤں کی منزل سے آگے نکل کر زندگی کے نئے نئے گوشوں اور زاویوں سے اردو قاری کو متعارف کروا رہے ہیں۔

فرحان حنیف وارثی (فروری 1966) نے نظم کے آنچل کو دل آویزی عطا کی اور اس کو پاکیزہ بنایا ہے۔ ان کی منظومات کا امتیازی وصف زندگی جینے کی خواہش اور خوش کن امیدوں سے مملو نظر آتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی زندگی کی بے اعتنائی، لاحاصلی کے احساس سے بھی روبرو کراتا ہے۔ یہ تشکیک اور زندگی میں یاس انگیزی کو بھی راہ دیتا ہے۔ زندگی کے زندہ حقائق امید وبیم کی کیفیت پیدا کرتے ہیں:

''میں جب کبھی بھولنے بیٹھتا ہوں
تمھیں
ہار جاتا ہوں دل سے
کرکٹ کے کسی میچ کی طرح''

(بہ حوالہ: نظم دل سے ہارا، کتاب 'ہینگر میں ٹنگی نظمیں' ص 141)

فرحان حنیف وارثی کی نظم نگاری ان کی تخلیقی بصیرت کی عکاس ہے ان کے ہاں علامت کی فراوانی ایک نئے جہانِ طلسم کا دروازہ وا کرتی ہے اور خود کلامی کا رومانی و موضوعی انداز نئی سمتوں میں پیش رفت کا موجب ہے۔ نظم میں ان کا فطری اور حقیقی اظہار نئے پن کی جستجو کا متلاشی ہے۔

برجیش عنبر (جولائی 1975) کا نظمیہ رویہ خونِ جگر کی آبیاری میں معجزۂ فن کے طور پر رونما ہوتا ہے۔ ان کے لیے نظمیہ عمل ایک مربوط عمل ہے ایک نامیاتی اکائی ہے۔ نظم کی بلند آہنگی اور موضوعات کے متنوع دھارے ان کے ہاں رواں دواں ہیں۔ برجیش عنبر کی نظمیں لفظیات، علائم اور فنی لوازم کے اہتمام کے سبب اپنا ایک حسن رکھتی ہیں۔ ان کی نظمیں تعمیرِ نو کی خواہش کے باوجود ناکامی اور لاحاصلی کی کیفیات کو ابھارتی ہیں۔ انسان اپنی آخری حد تک زندگی میں خود کی خواہشات کا اسیر ہوتا ہے، یہی کیفیت اسے خود غرض اور خود پسند بناتی ہے۔ اپنے تعصّبات حسب خواہش ترجیحات کو جنم دیتے ہیں، یہ تاثرات ان کی نظموں میں شدت کے ساتھ سامنے آتے ہیں:

نمی اب نام کو ملتی کہاں ہے ان فضاؤں میں
ہوا کے ہونٹ سوکھے ہیں
اکیلا اونٹ اپنی داڑھ کی کھجلی مٹاتا ہے
کسی کی یاد میں کب کون اپنی عمر کھوتا ہے

(بہ حوالہ: نظم کسی کی یاد میں کب کون اپنی عمر کھوتا ہے، برجیش عنبر، سہ ماہی استفسار، جے پور، دسمبر 2020، ص 185)

برجیش عنبر کی نظم دورِ حاضر کی حسیت کا آئینہ ہے۔ نظم نگار نے دراصل باطن کی غواصی بڑے ہی چاؤ سے کی ہے جس کے سبب ان کی چشم ہر رنگ میں وا رہتی ہے۔

شہرام سرمدی (اکتوبر 1975) ذات کی گہرائیوں کو شعری پیکر میں ڈھالنے والے نظم نگار شاعر ہیں۔ ان کی نظم نگاری، نظم کی ہمہ گیریت، نئی جہتوں اور نئے ابھاروں کا احاطہ کرتی ہے۔ نظم نگار نے نظم کا نیا لغت تشکیل دیا ہے۔ ان کی نظمیں خلاقانہ تازہ کار اسلوب کو زندگی اور انسانی تاریخ کا گہرا درک عطا کرتی ہیں۔ مختصر اظہار شدید تاثر پیدا کرتا ہے اور کبھی کبھی کسی معنی خیز تلمیح کا نقش نمایاں کرتا ہے:

تمھارا گریہ شب وہ سہانا خواب اور وہ سجدۂ حاجات
سب کچھ رب عزت کو پسند آیا
مگر ہم لوگوں کو تعبیر کے لائق نہیں پایا

(بہ حوالہ نظم باز آمد، کتاب حواشی، شہرام سرمدی، ص 141)

شہرام سرمدی کی جمالیاتی قدر زبان کا نیا پن، بامعنی روح عصر کی ترجمانی اور سحر کاری کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ فکر و خیال کی کائنات گیری کا رجحان ان کی نظم میں انسانی دردمندی کو اس کے جمالیاتی منشور میں نقطۂ پرکاری کی مرکزیت بناتا ہے۔

صابر (دسمبر 1975) کی زندگی افروز نظمیں ان کے باطن کے روشن چراغ ہیں۔ ان کے ہاں فرد، سماج اور وجود کے حوالے سے اُبھرنے والے سوالوں کی تخلیقی صورت گری خوب ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں جدید زندگی کی بوقلمونی، تلون اور انسانی رویوں کی ہمہ رنگی پائی جاتی ہے۔ زندگی میں ہمارے مقصد اور منشا کے مطابق کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اعتبارات اور مفروضات ہمیشہ ٹوٹ جاتے ہیں اور ہم کسی کے نہیں رہتے۔ ناکامی و نامرادی ہی زندگی کی حقیقت ہے:

اپنے زخموں کی نمائش کر کے
داد پانے کی کیے جاتا ہوں کوشش بے جا
قصہ گو جیسے کوئی
اپنے ماضی کے فسانوں کا پلندہ لے کر
ہر نئے وقت کے دروازے پر
کچھ جھجکتے ہوئے آہستہ سے دستک دے دے

(بہ حوالہ: نظم داد خواہ، صابر، ذہنِ جدید، دہلی، شمارہ 52، ستمبر 2008 تا فروری 2009 ص 104)

صابر کی نظمیں تغزل کی روایت، رکھ رکھاؤ، تکنیک اور علائم و رموز کی ایک عمدہ مثال ہیں۔ ان کی احساس پرور خیال انگیز نظمیں فکری گہرائی اور جمالیاتی رچاؤ کے سبب اسالیب کے اختراع و تنوع کا بھی عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔

عادل رضا منصوری (اگست 1978) کی نظم فکری و موضوعی گہرائی، سنجیدہ، متوازن اور اعلا معیار قائم کرتی ہیں۔ ان کی نظم جمالیاتی وحدت، تہ داری اور پہلو داری سے عبارت ہے۔ ان کی نظمیں جدید حسیت اور زندگی کی لایعنیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ زندگی کا یہی ادھوراپن حقیقت بن کر نمایاں ہوتا ہے جہاں دیکھیے یہی بے ربطی اور بے کیفی کی تصویر نظر آتی ہے۔ مختصر نظم میں اس کی شدت شدید تاثر پیدا کرتی ہے:

ایک عصا سے
دریا چیرا
اور مردوں کو جیون بخشا
سنتے سنتے
اُس کی صدائیں
لیکن یہ کل کی باتیں ہیں

(بہ حوالہ: نظم میرا ماضی میرا حال، کتاب سناٹے کی پرچھائیں، عادل رضا منصوری، ص 136)

عادل رضا منصوری کی نظمیہ شاعری دراصل ان کے جذبات، زبان اور مشاہدۂ زندگی کا حصہ ہے جس میں نظم نگار کی افتادِ طبع، فن کا معیار ہے۔

فی زمانہ دائرۂ نظم سکڑ اور سمٹ رہا ہے۔ ایسی صورت میں بالائی سطور میں پیش کردہ منتخب پانچ شعرا کی نظموں کے مختصر جائزے سے مترشح ہوتا ہے کہ ان شعرا نے شعری جمالیات کی نئی قدر بندی کی ہے، جس سے ان کی نظم کی ایک منفرد شناخت سامنے آتی ہے۔ نظم درحقیقت معنوی پیچیدگی کا عمل ہے مگر اس میں مذکورہ شعرا اپنی گُل کاری اور فن کاری سے کامیاب ہوئے ہیں اور اپنی نظمیہ سرگرمیوں میں محوِ سفر ہیں۔

'سائبان' زبیر کالونی، ہگارگا کروس، رِنگ روڈ، گلبرگہ-585104 کرناٹک
E-mail: ghazanfaronnet@gmail.com
Mob. No. 9945015964

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

اردو دُنیا

حیدرآباد میں اندرونِ ایک سال 23 اقامتی اسکولوں کی تعمیر کی ہدایت

حیدرآباد (8 جنوری)۔ وزیرِ اعلا ریونت ریڈی نے محکمۂ تعلیم کے اعلا عہدیداروں کے ساتھ منعقدہ اجلاس میں سرکاری اسکولوں میں بریک فاسٹ اور لنچ کی فراہمی کے انتظامات کا جائزہ لیا۔ جائزہ اجلاس میں حکومت کے مشیران ڈاکٹر کے. کیشوراؤ، سدرشن ریڈی، نریندر ریڈی، چیف سکریٹری رام کرشنا راؤ، وزیرِ اعلا کے پرنسپل سکریٹری شیشادری، اسپیشل سکریٹری اجیت ریڈی، کمشنر ایجوکیشن یوگیتا رانا، کونسل فار ہائر ایجوکیشن کے صدر نشیں بالا کرشنا ریڈی اور وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی پروفیسر کمار اور دوسروں نے شرکت کی۔ وزیرِ اعلا نے شہر اور اضلاع میں سنٹرلائزڈ کچن کے ذریعے طلبہ کو معیاری اور صحت بخش ناشتہ اور لنچ فراہم کرنے کی عہدیداروں کو ہدایت دی۔ انھوں نے کہا کہ ہر دو اسمبلی حلقوں کے لیے ایک سنٹرلائزڈ کچن کا قیام عمل میں لایا جائے۔ انھوں نے سولر کچن کے قیام کی تجویز پیش کی اور اس سلسلے میں عہدیداروں کو پیش رفت کی ہدایت دی۔ ینگ انڈیا اینٹی گریٹڈ اقامتی اسکولوں کے تعمیری کام تیز کرنے کی بھی عہدیداروں کو ہدایت دی گئی۔ وزیرِ اعلا نے کہا کہ حکومت اینٹی گریٹڈ اقامتی اسکولوں کے لیے مناسب بجٹ جاری کرے گی۔ چیف منسٹر نے عہدیداروں سے کہا کہ اینٹی گریٹڈ اقامتی اسکولوں کے پہلے مرحلے کی تکمیل پر طالبات کے لیے زائد اسکول مختص کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ تین برسوں میں ہر حلقۂ اسمبلی میں بوائز اور گرلز کے اقامتی اسکول قائم کیے جائیں۔ وزیرِ اعلا نے تجویز پیش کی کہ دو ایکڑ اراضی پر سنٹرلائزڈ کچن قائم کیے جائیں اور ضرورت پڑنے پر 99 سال کی لیز پر اراضی حاصل کی جائے۔ گریٹر حیدرآباد کے حدود میں آئندہ تعلیمی سال تک 23 نئے اسکولوں کی عمارت کی تعمیر کا کام مکمل کرنے کی ہدایت دی گئی۔ وزیرِ اعلا نے کہا کہ بنیادی سہولتوں کی فراہمی حکومت کی اولین ترجیح ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسکولوں کو غریب طلبہ کے لیے بہتر تعلیم کے مراکز میں تبدیل کیا جائے۔

(سیاست۔حیدرآباد)

کوڑنگل بلدیہ کے سائن بورڈ پر اُردو املا کی سنگین غلطی
بلدیہ کو 'بندیہ' لکھ دیا گیا

تانڈور (8 جنوری)۔ ریاستی وزیرِ اعلا ریونت ریڈی کے حلقۂ اسمبلی کوڑنگل میں نئے بلدیہ دفتر کے افتتاح کی تیاریاں زور وشور سے جاری ہیں، تاہم افتتاح سے قبل ہی ایک سنگین غلطی پر نظر پڑ گئی ہے۔ بلدیہ دفتر کے سائن بورڈ پر اردو زبان میں 'بلدیہ' کے بجائے 'بندیہ' تحریر کیا گیا ہے جو نہ صرف املا کی غلطی ہے بلکہ اردو زبان کی توہین کے مترادف بھی قرار دی جا رہی ہے۔ بلدیہ دفتر کی عمارت پر تلگو اور انگریزی کے ساتھ اردو میں نام درج کیا گیا ہے، مگر اردو تحریر میں واضح غلطی دیکھ کر اردو داں طبقہ اور سماجی کارکنوں میں ناراضگی پائی جا رہی ہے۔ محبانِ اردو اور اردو زبان کے ذمے داروں نے مطالبہ کیا ہے کہ افتتاح سے قبل فوری طور پر اس غلطی کی اصلاح کی جائے اور آئندہ ایسے سائن بورڈ تیار کرنے سے پہلے اردو ماہرین سے تصدیق کرائی جائے۔ عوام نے اس معاملے پر متعلقہ حکام کی لاپروائی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اعلا حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ اس غلطی کو درست کیا جائے اور آئندہ اس طرح کے واقعات پیش نہ آئیں۔ (سیاست۔حیدرآباد)

سرسیّد کی طرح پروفیسر حبیب الرحمٰن مرحوم کی علمی وادبی خدمات ناقابلِ فراموش
اردو آرٹس ایوننگ کالج اور اورینٹل کالج کے احیا کے لیے اردو داں طبقے کو آگے آنے پر زور

حیدرآباد (7 جنوری)۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن بانی اردو ہال ٹرسٹ، اردو مجلس، اردو آرٹس ایوننگ کالج اور اردو ماڈل اسکول حمایت نگر، حیدرآباد کی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں اردو آرٹس ایوننگ کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام اردو ہال حمایت نگر میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ پروفیسر سیّد عبدالمجید بیدار (سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی) نے صدارت کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے پروفیسر حبیب الرحمٰن مرحوم کی گراں قدر خدمات کا ذکر کیا اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انھوں نے اردو آرٹس ایوننگ کالج کے دوبارہ آغاز کی اہمیت کو واضح کیا۔ جلسے میں طلبۂ قدیم اردو آرٹس ایوننگ کالج کے علاوہ محبانِ اردو کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

پروفیسر اشرف رفیع (سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی) نے کہا کہ جس طرح سرسیّد نے قوم وملّت کے لیے ٹھوس خدمات انجام دیں، اسی طرح پروفیسر حبیب الرحمٰن مرحوم نے بھی قوم کو جگایا اور تعلیمی پس ماندگی کے خاتمے کی غرض سے کالج قائم کرکے اخلاص کے ساتھ بے مثال اور قابلِ تقلید کام کیا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو آرٹس ایوننگ کالج حمایت نگر کے دوبارہ آغاز کے لیے سب کو عملی طور پر تعاون کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ علی سروری (ایسوسی ایٹ پروفیسر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی) نے کہا کہ اردو ذریعۂ تعلیم سے اپنی اعلا تعلیم مکمل کرنے والے طلبہ کے لیے بھی ترقی کے مواقع موجود ہیں۔ انھوں نے اردو آرٹس ایوننگ کالج کے احیا کی بھرپور تائید کی۔ ڈاکٹر سیّد اسلام الدین مجاہد ایڈوکیٹ (سابق ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو آرٹس ایوننگ کالج) نے پروفیسر حبیب الرحمٰن کی علمی خدمات اور قربانیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اردو آرٹس ایوننگ کالج کے دوبارہ آغاز کے لیے تحریک چلانے میں تعاون کی پیش کش کی۔ پروفیسر محمد مسعود احمد نے اپنے تعلیمی دور کا ذکر کرتے ہوئے اردو ذریعۂ تعلیم کی اہمیت کو واضح کیا اور پروفیسر حبیب الرحمٰن کی بے لوث تعلیمی خدمات کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر خواجہ ناصرالدین (ڈائرکٹر شاداں ایجوکیشن سوسائٹی) نے تعلیم کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے معیار وقابلیت پیدا کرنے پر زور دیا اور کہا کہ اردو آرٹس ایوننگ کالج کا دوبارہ احیا ممکن ہے۔ ڈاکٹر عتیق اقبال (سابق پرنسپل اردو آرٹس ایوننگ کالج) نے اس کالج کی کارکردگی بیان کی اور کن وجوہ کے باعث کالج بند ہوا اس کی وضاحت کی۔ پروفیسر شاہ محمد ذوالفقار محی الدین صدیقی نے اردو کے ان اداروں کے قیام کے لیے پروفیسر حبیب الرحمٰن کی خدمات کا ذکر کیا اور ان کو دوبارہ آغاز کرنے کی اپیل کی۔

اس موقعے پر جناب سیّد حامد حسین شطاری نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ جناب محمد معین الدین اختر (صدر اردو آرٹس ایوننگ کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن) نے مہمانوں اور جلسے کے شرکا کا خیر مقدم کیا اور اردو آرٹس ایوننگ کالج اور اورینٹل اردو کالج کے دوبارہ احیا کے لیے متعلقہ انتظامیہ سے اپیل کی۔ انھوں نے کہا کہ بصورتِ دیگر دوسرے متبادل تعلیمی اسکیم پر عمل کرنے پر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مکمل تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ جناب سیّد ظہورالدین نے نظامت کے فرائض انجام دیے جب کہ جناب محمد عبدالمجید نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (سیاست۔حیدرآباد)

حکومتِ بہار اردو کے عملی نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے کوشاں ہے: نوشاد عالم

پٹنہ (13 جنوری)۔ اردو مشاورتی کمیٹی بہار کے چیئرمین نوشاد عالم نے کہا ہے کہ وزیرِ اعلا نتیش کمار کی قیادت میں ریاستی حکومت اردو زبان کے فروغ کے لیے ایمانداری سے کام کر رہی ہے۔ ساتھ ہی حکومت اردو کے عملی نفاذ کے لیے کوشاں ہے۔ اس کے لیے مختلف قدم اٹھائے جا رہے ہیں۔ پی ایم ڈی آر ایف کے شریک ڈائرکٹر پروفیسر فیروز منصوری نے کہا کہ بہار کے وزیرِ اعلا نتیش کمار کی اردو زبان سے خصوصی محبت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کی دوراندیش، جامع اور ہمدرد قیادت میں بہار حکومت اردو زبان کے تحفظ، فروغ اور ترقی کے لیے مسلسل مضبوط اور موثر اقدام کر رہی ہے۔ اردو زبان کو عوام الناس تک بالخصوص گاؤں گاؤں تک پہنچانے کے عزم کے ساتھ ریاستی حکومت پوری سنجیدگی اور وابستگی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ اسی تسلسل میں بہار حکومت کے اردو ڈائرکٹوریٹ کے تحت 12 دسمبر 2025 کو منعقدہ اردو مشاورتی کمیٹی کی میٹنگ میں معزز چیئرمین نوشاد عالم اور کمیٹی کے اراکین کی جانب سے پیش کردہ اہم تجاویز کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ ان منظور شدہ تجاویز کی روشنی میں ریاست میں اردو زبان کی ترقی کے لیے کئی اہم فیصلے لیے گئے ہیں۔ منظور شدہ فیصلوں کے مطابق (1) ضلع سطح پر منعقد ہونے والے اردو پروگراموں مثلاً سمینار، مشاعرہ، مباحثہ، مذاکرہ وغیرہ میں اردو مشاورتی کمیٹی کے معزز چیئرمین اور اراکین کی شرکت کو یقینی بنایا جائے۔ (2) اضلاع میں تعینات اردو اساتذہ کو اردو سے متعلق مختلف پروگراموں میں فعال طور پر حصہ لینے کے لیے ضروری ہدایات جاری کی جائیں گی۔ (3) اردو داں شہریوں کو سرکاری دفاتر میں اردو زبان میں درخواستیں پیش کرنے کے لیے بیدار کرنے کی غرض سے خصوصی مہم چلائی جائے گی۔ یہ فیصلے بہار میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کے طور پر مزید مضبوط، موثر اور عملی بنانے کی سمت ایک تاریخی اور دور رس اقدام ہیں۔ اس سے نہ صرف اردو زبان کو ادارہ جاتی مضبوطی حاصل ہوگی بلکہ اردو داں سماج میں خودداری اور شمولیت کا جذبہ بھی مزید مستحکم ہوگا۔ اردو مشاورتی کمیٹی کے چیئرمین اور اراکین نے بہار کے معزز وزیرِ اعلا جناب نتیش کمار جی کے تئیں تشکر کا اظہار کیا۔ (قومی تنظیم۔پٹنہ)

سیّد شاہد مہدی کے انتقال پر غالب انسٹی ٹیوٹ کا اظہارِ تعزیت

نئی دہلی (22 دسمبر)۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر اور ممتاز ماہرِ تعلیم سیّد شاہد مہدی کے انتقال کی خبر سے علمی وتعلیمی حلقوں میں گہرے رنج وغم کی لہر دوڑ گئی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ ان کے انتقال سے علمی وادبی دنیا میں ناقابلِ تلافی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ سیّد شاہد مہدی ایک صاحبِ بصیرت تعلیمی رہنما تھے جنھوں نے اپنے دورِ وائس چانسلری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تعلیمی، انتظامی اور تحقیقی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ علم، رواداری اور ادارہ جاتی استحکام کے علمبردار تھے اور طلبہ واساتذہ میں یکساں طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا سیّد شاہد مہدی جتنی اچھی انتظامی صلاحیت رکھتے تھے، ادب پر بھی ان کی اتنی ہی گہری نظر تھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ میں وہ اکثر تشریف لاتے تھے اور ان کی بصیرت افروز تقریر سے ہم سب استفادہ کرتے تھے۔ میں ان کے پس ماندگان کو تعزیت پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور ان کے وابستگان کو صبرِ جمیل دے۔

ساہتیہ اکیڈمی کے زیرِ اہتمام

ہند-روس مصنّفین کے درمیان مکالمہ

نئی دہلی (13 جنوری)۔ساہتیہ اکیڈمی کے ثقافتی تبادلۂ پروگرام کے تحت روس سے آئے چھے ممتاز ادیبوں اور ہندستانی مصنّفین کے درمیان ایک تفصیلی ادبی مکالمہ منعقد ہوا۔اس پروگرام میں روسی ادب اور ہندستانی ادب کے باہمی تعلقات، ترجمے اور ثقافتی اثرات پر تبالۂ خیال کیا گیا۔روس کے ادیبوں میں ایلینا کریموواِ، یاروسلاوا پولینووچ، رومن سینچن، الیا کو چیرگن اور ایرینا کرائیوا شامل تھیں۔ان کے ساتھ مکالمے میں ہندستانی ادیب رویل سنگھ، سکرتا پال کمار، بلرام، دیویندر چوبے، شمع شرما اور راج کمار گوتم شریک رہے۔ پروگرام کی صدارت رویل سنگھ نے کی جب کہ ساہتیہ اکیڈمی کے صدر مادھو کوشک آن لائن شریکِ پروگرام تھے۔

پروگرام کے آغاز میں ساہتیہ اکیڈمی کے نائب سکریٹری (انتظامیہ) نے تمام مہمان روسی ادیبوں کا استقبال اکیڈمی کی مطبوعہ کتابیں پیش کر کے کیا۔اپنی صدارتی تقریر میں ساہتیہ اکیڈمی کے صدر مادھو کوشک نے روسی ادیبوں کا پُرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ہندستان اور روس کی دوستی روز بروز مضبوط ہو رہی ہے، جس میں دونوں ممالک کے ادیبوں کا اہم کردار ہے۔انھوں نے کہا کہ ہندستان اور روس کا رشتہ دہائیوں پر محیط ہے اور یہ تعلق سیاسی نہیں بلکہ ادبی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس ادبی رشتے کو ترجمے کے ذریعے مزید مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ روس سے آئے یہ ادیب پبلشنگ ہاؤس او جی آئی کے نمائندہ وفد کا حصہ تھے، جن میں بعض بچوں کے ادب سے وابستہ ادیب بھی شامل تھے۔ تمام روسی ادیبوں نے ہندستان کے تئیں اپنی محبت اور احترام کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندستان کی روحانیت، یہاں کی محبت اور رابندر ناتھ ٹیگور سے لے کر پریم چند تک کا ادب انھیں بے حد متاثر کرتا ہے۔ روسی ادیبوں نے ہندستان کے دورے پر مسرت کا اظہار کیا۔ ہندستانی ادیبوں نے بھی اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ روسی ادب ان کی ادبی تربیت اور سفر کا اہم حصہ رہا ہے۔انھوں نے روس میں نئی نسل پر سوشل میڈیا کے اثرات سے متعلق سوالات بھی اٹھائے۔ پروگرام میں سنٹرل یونیورسٹی آف انگلش اینڈ فارن لنگویجز کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ابھے موریہ سمیت کئی نامور ادیب اور مترجمین موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت نائب سکریٹری ڈاکٹر شنمکھ آنند نے کی اور انھوں نے سونوسینی سمیت تمام معاونین کا پروگرام کو کامیاب بنانے پر شکریہ ادا کیا۔

(انقلاب۔دہلی)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی 50 ایکڑ اراضی کو واپس لینے کے منصوبے پر

تلنگانہ حکومت کے خلاف طلبہ کا احتجاج

حیدرآباد (8 جنوری)۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں گذشتہ روز اس وقت احتجاج شروع ہوگیا جب تلنگانہ حکومت نے یونیورسٹی کی 50 ایکڑ اراضی کو واپس لینے کی تجویز واپس لیتے ہوئے نوٹس جاری کیا جسے طلبہ نے ’عوامی تعلیم پر حملہ‘ قرار دیا۔ مانو اسٹوڈنٹس کلیکٹو کے بینر تلے طلبہ نے سنٹرل لائبریری سے بابِ علم تک ریلی نکالی، ’زمین چوری نامنظور‘ جیسے نعرے لگائے اور نوٹس کو فوری طور پر واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ یہ احتجاج 15 دسمبر کو رنگا ریڈی ڈسٹرکٹ کلکٹر کے دفتر سے مانو کے رجسٹرار اشتیاق احمد کو جاری کردہ نوٹس کے بعد کیا گیا تھا، جس میں ان سے سات دنوں کے اندر وضاحت پیش کرنے کو کہا گیا تھا کہ گنڈی پیٹ منڈل کے مانی کونڈہ گاؤں میں سروے نمبر 211 اور 212 میں 50 ایکڑ اراضی کیوں واپس نہ لی جائے۔نوٹس میں کہا گیا ہے کہ مانو کو 1988 میں الاٹ کی گئی 200 ایکڑ اراضی میں سے تقریباً 150 ایکڑ پر عمارتیں بنی ہوئی ہیں جب کہ 50 ایکڑ خالی پڑی اراضی ہے، جسے انتظامیہ نے ’غیر استعمال شدہ‘ قرار دیا ہے۔

نوٹس میں کہا گیا تھا کہ یہ زمین بطورِ پرائم گورنمنٹ اراضی کے طور پر الاٹ کی گئی تھی اور شرائط کی خلاف ورزی کی وجہ سے غیر استعمال شدہ حصوں کو دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔اس نے فزیکل معائنہ کی رپورٹوں اور سابقہ کارروائیوں کا حوالہ دیا۔ یونیورسٹی نے اس کے بعد تفصیلی جواب دینے کے لیے دو ماہ کا وقت مانگا تھا۔احتجاج کے دوران خطاب کرتے ہوئے طلبہ کے رہنما طلحہ منان نے کہا کہ یہ اقدام یونیورسٹی کو لینڈ بینک کے طور پر دیکھنے کے خطرناک رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔انھوں نے کہا کہ ’’یہ کوئی الگ تھلگ انتظامی کارروائی نہیں ہے۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح حیدرآباد یونیورسٹی کی زمین پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مانو کے طلبہ یہاں ایسا نہیں ہونے دیں گے‘‘۔ مانو طلبہ یونین کے سابق صدر متین اشرف نے کہا کہ حکومت کا یہ اقدام ایسے وقت میں تضاد سے پُر ہے جب یونیورسٹی کو ہاسٹلز کی شدید کمی کا سامنا ہے۔انھوں نے کہا کہ سیکڑوں طلبہ خاص طور پر پس ماندہ اور اقلیتی برادریوں سے تعلق رکھنے والے رہائش کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس زمین کو ہاسٹل، لائبریری اور تعلیمی انفراسٹرکچر بنانے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے، قبضے کے نام پر چھینا نہیں جانا چاہیے۔

(انقلاب۔دہلی)

اررریہ ضلع کے یومِ تاسیس پروگرام میں دوسری سرکاری زبان اُردو نظر انداز

اررریہ (16 جنوری)۔ضلع یومِ تاسیس کے موقعے پر بہار کی دوسری سرکاری زبان اردو کو نظر انداز کیے جانے کے معاملے نے اب سنگین شکل اختیار کر لی ہے۔نوجوان سماجی کارکن اور ضلع پریشد نمائندہ فیصل جاوید یاسین کے الزامات کے بعد اب اردو کی سب سے بڑی تنظیم انجمن ترقی اردو ضلع اررریہ نے بھی اس پر ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔انجمن ترقی اردو ضلع اررریہ کے صدر رضی احمد تنہا نے کہا کہ اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے اور اس سلسلے میں حکومت کے واضح احکامات موجود ہیں، اس کے باوجود ضلع یومِ تاسیس جیسے اہم سرکاری پروگرام میں اردو کو مکمل طور پر نظر انداز کرنا نہ صرف افسوسناک بلکہ قابلِ مذمت بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ رویّہ اردو زبان اور اردو بولنے والے شہریوں کے جذبات کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔انھوں نے کہا کہ اررریہ کی تاریخ، تہذیب اور تمدن میں اردو زبان کا اہم کردار رہا ہے، مگر انتظامیہ جان بوجھ کر اردو کو حاشیے پر ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے، جسے کسی بھی صورت میں قبول نہیں کیا جاسکتا۔اگر سرکاری تقاریب میں اردو کو اس کا آئینی و قانونی حق نہیں دیا گیا تو انجمن ترقی اردو خاموش نہیں بیٹھے گی۔

(قومی تنظیم۔پٹنہ)

اُردو زبان و ادب کا پہلا محقق و مدرس

جان بارتھ وِک گل کرسٹ

تالیف و ترجمہ

صدیق الرحمٰن قدوائی

قیمت:250روپے

رفتید ولے نہ از دلِ ما

پروفیسر محمد ذاکر

نئی دہلی۔اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، محقق اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر محمد ذاکر کا 28 دسمبر 2025 کو انتقال ہوگیا۔ان کی عمر 90 برس سے زیادہ تھی۔ پس ماندگان میں سات بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں، جب کہ اہلیہ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا ہے۔ان کی نمازِ جنازہ اور تدفین سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں مہندیان قبرستان میں عمل میں آئی۔

پروفیسر محمد ذاکر نے اینگلو عربک اسکول، سینٹ اسٹیفن کالج آف کامرس اور ذاکر حسین دہلی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ بعدازاں وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے بطورِ استاد وابستہ ہوئے، جہاں وہ شعبۂ اُردو کے صدر بھی رہے اور اسی ادارے سے بحیثیت پروفیسر سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر محمد ذاکر کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں اردو اکادمی، دہلی اور اتر پردیش اردو اکادمی کی جانب سے مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔اردو اکادمی دہلی نے انھیں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔

رشید عباس

ممبئی۔ بھساول کے ممتاز بزرگ اُردو ادیب رشید عباس 20 اور 21 دسمبر 2025 کی شب میں 87 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ رشید عباس 5 جون 1938 کو نصیر آباد، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر میں پیدا ہوئے تھے، وہ اِدھر ایک عرصے سے صاحبِ فراش تھے۔ رشید عباس ایک اچھے انشائیہ نگار اور طنز و مزاح کے پیرایے میں لکھنے والے اردو کے ایک معروف ادیب تھے۔ وہ اپنے چھوٹوں کے ساتھ ہمیشہ شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ وہ کوئی تین دہائی قبل ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ بھساول کے اُدبا و شعرا کا جب بھی تذکرہ ہوگا اس میں رشید عباس کا نامِ نامی اپنے اخلاصِ علمی اور اخلاقِ شخصی دونوں لحاظ سے اوّل اوّل لیا جائے گا۔ بھساول میں انھوں نے کُل ہند مشاعرے بھی منعقد کیے اور اُس دور کے مشاہیر شعرا سے ان کے روابط تھے۔انھوں نے ممبئی میں تعلیم ہی حاصل نہیں کی بلکہ اپنی عملی زندگی کی ابتدا 1956 میں ممبئی ہی سے کی تھی۔ وہ بمبئی میونسپل کارپوریشن کے شعبۂ درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ ممبئی نمبر 3 کے ایک میونسپل اسکول میں انھوں نے بچوں کو پڑھایا۔ مشہور شاعر ظفر گورکھپوری سے ان کے بہت اچھے روابط تھے۔

پروفیسر احمد رضا صدیقی

پٹنہ۔اردو کے معروف ادیب پروفیسر احمد رضا صدیقی 22 دسمبر 2025 کو انتقال فرما گئے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ان کی پیدائش رمضان پور میں ہوئی تھی جو کہ بہار شریف کے پاس ایک گاؤں ہے۔ان کی ابتدائی تعلیم مدرسے میں ہوئی۔ انھوں نے 1966 میں میٹرک پاس کیا، پھر پورنیہ کے ایک کالج سے پری یونیورسٹی کا امتحان پاس کیا۔ بھاگلپور یونیورسٹی سے انھوں نے بی اے میں اول پوزیشن حاصل کی۔ 1971 سے 1973 تک پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ایم اے کیا اور پھر فارسی زبان میں بہار یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی۔ 1973 سے 1981 تک انھوں نے ایل آئی سی میں ملازمت کی اور اس کے بعد انھوں نے اے پی ایس ایم کالج برونی میں استاد کے طور پر شمولیت اختیار کی۔ 1987 میں ان کا تبادلہ اے این ایس کالج باڑھ میں ہوا، جہاں سے 2016 میں انھوں نے رٹائرمنٹ لے لیا۔ان کو اردو کے ساتھ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔

ادارہ ’ہماری زبان‘ مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : درد میں تیرتے پھول (شعری مجموعہ)
شاعر : پرویز مظفر
اشاعت : 2025
ضخامت : 240 صفحات
قیمت : 399 روپے
ناشر : مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، مظفر لین، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی-110025
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر

E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com

پرویز مظفر پیدا تو ہندستان میں ہوئے، لیکن انھوں نے اپنے آذوقۂ حیات کے لیے برمنگھم (برطانیہ) کو اپنا وطنِ ثانی بنایا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام اور منفرد لب و لہجے سے دیارِ غیر میں لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ موصوف نے ساقی فاروقی اور مظفر حنفی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، اس لیے ان کی شاعری میں دونوں کا عکس نظر آتا ہے، لیکن انھوں نے جس انوکھے انداز میں شعر کہے وہ لائقِ تحسین ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ایک خاص طرح کا کرب موجود ہے جس سے قارئین متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کا اندازہ ان کے مجموعوں 'تھوڑی سی روشنی' اور 'اداس نظمیں' سے کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عصری مسائل اور زندگی کے تلخ تجربوں کو خاص جگہ دی۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں دیارِ غیر کے مسائل کو بھی خوب صورت پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر شعری مجموعے 'درد میں تیرتے پھول' میں پرویز مظفر نے نظموں اور غزلوں کو شامل کیا ہے۔ ان کی نظموں میں روپ، اندھیرا، حقوق، ہنڈولا، خواہش، ایمبولینس، سچ، دھواں، وہ بہتر لوگ، فلسطین، Wind Rush، اکیلے، آواز، نئی تصویر، Trimmer، ہم مسکرانے لگے، منظر بدل گیا، حسن کی دھوپ، بلبلے، انتظار اور خیمہ وغیرہ اہمیت کی حامل نظمیں ہیں۔ ان کی نظموں کے عناوین سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کی بے ثباتی اور مشکلات کو کتنی آسانی سے بیان کیا ہے، جس خوش سلیقگی کے ساتھ انھوں نے دیارِ غیر میں بیٹھ کر ہندستان کی باتیں کی ہیں یہ ان کے ذاتی کرب و احساس کی عمدہ ترجمانی ہے۔ مجموعے میں شامل نظم 'ہنڈولا' یوں تو ایک سادہ سی نظم ہے، لیکن اس کے مفاہیم بہت اعلا و ارفع ہیں۔ اس نظم میں پرویز مظفر نے زندگی کو ایک ہنڈولے سے تعبیر کرتے ہوئے ماضی، حال اور مستقبل کے علاوہ زندگی کی جمالیات پر بھی گفتگو کی ہے۔ شاعر کی نظر میں انسان جو خواب دیکھتا ہے اس کی تعبیر کے لیے جسم کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ضروری ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

آنکھوں میں/ ہنڈولے سا جھولتا وقت/ بیتی دنیا یاد آنے
لگی/ رنگین بستیوں میں/ خلوص سے بھرے دل/ محبت کے
وہ کنوئیں تالاب/ وہی آب پی کر/ تعمیر ہوئی ہمارے بدن کی
عمارت/ جسے ہم منتقل کرنا چاہتے ہیں

پرویز مظفر حساس شخصیت کے مالک ہیں۔ انسانیت ان کا مذہب ہے، اس لیے انسانیت کا دکھ درد ان کا ذاتی دکھ درد محسوس ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں ایسی نظمیں موجود ہیں جن میں کراہتی ہوئی انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ 'ایمبولینس' اور 'وہ بہتر لوگ' ایسی ہی نظمیں ہیں جن میں لوگوں کے دکھوں پر مرہم لگانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ 'ایمبولینس' نظم میں پرویز مظفر کہتے ہیں:

'سائرن بجاتی ہوئی/ دل کو دہلاتی ہوئی/ گھر کے سامنے
سے گزری/ پھر کسی گھر میں غم ہوگا/ شاید ماتم ہوگا/ اسی سوچ
میں گم تھے ہم/ کہ پھر/ آواز سنائی دی/ ایک اور ایمبولینس
دکھائی دی/ ماتمی فضا کہیں اور ہوگی۔'

پرویز مظفر نے گرن فل ٹاور (Grenfil Tower) لندن کے حادثے سے متاثر ہوکر 'وہ بہتر لوگ' نظم تخلیق کی۔ کسی شاعر کا دردناک واقعے سے متاثر ہوکر نظم کہنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کے سینے میں ایک ایسا دل دھڑک رہا ہے جو انسانی غم کو اپنا غم تسلیم کرتا ہے۔ یہ اس بات کی جانب واضح اشارہ ہے کہ پرویز مظفر جس سرزمین پر اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں کے مسائل و حادثات کو اپنی نظموں میں بیان کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ دراصل گرن فل ٹاور (واقع مغربی لندن) ایک چوبیس منزلہ عمارت ہے جس میں 14 جون 2017 کو دیر رات آگ لگ گئی اور اس آگ پر 60 گھنٹوں کے بعد قابو پایا جاسکا۔ اس بلڈنگ میں رہنے والے ستر سے زیادہ افراد اس حادثے کا شکار ہوئے۔ پورا لندن اس حادثے سے متاثر ہوا۔ اس لیے پرویز مظفر نے اس حادثے کو نظم کے پیرایے میں پیش کیا:

'وہ بہتر زندگی آگ کے درمیان/ مجبور کھڑے ادھر/ تماشائی
سارے/ وہ بیچارے/ امید کے سہارے/ دعا کو ہاتھ
اٹھائے/ کہ باہر تو جانا ہے/ اپنی جان کو/ جان تو بچانا
ہے/ اسی آس میں/ کھڑکیوں سے/ زمین و آسمان کو/ تکتے
ہوئے/ دعا کو ہاتھ اٹھائے/ ایک آس لگائے/ چپ چاپ
زہر پیتے رہے/ اور پھر اسی دھوئیں میں/ کھو گئے۔'

زیرِ نظر مجموعے میں پرویز مظفر نے اپنی غزلوں کے موضوعات میں تنوع لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق، پند و نصائح، عشق و رومان اور زندگی کے کرب، وطن سے محبت وغیرہ موضوعات کو خاص مقام حاصل ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں لفظیات کی جمالیات پر خاص توجہ دی ہے۔ سادہ و عام لفظوں کی پیکر تراشی سے انھوں نے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ ایک زمانے سے برمنگھم (لندن) میں مقیم ہیں، لیکن ان کی غزلوں کے خمیر میں ہندستانی تہذیب و ثقافت کی تاثیر بہ درجۂ اتم موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے عام فہم الفاظ کو خاص انداز میں پیش کیا:

چاند ستارے دیکھ لیے سب تھے بے نور
گھر آیا پرویز مظفر آخر کار

......

وہ جھوم رہے تھے تیری آواز پہ پرویز
اشعار کی تاثیر کسی نے نہیں دیکھی

......

اگر پرویز ہندوستان میں نا مطمئن تھے ہم
یہاں برطانیہ میں بھی رہے افسردہ افسردہ

پرویز مظفر نے اپنے اساتذہ ساقی فاروقی اور مظفر حنفی کو اپنی غزلوں میں نذرانہ پیش کیا ہے۔ دونوں شخصیات سے وہ ہمیشہ متاثر رہے۔ جب تک پرویز صاحب ہندستان میں رہے تو انھوں نے اپنے والد مظفر حنفی سے کسبِ فیض کیا۔ برطانیہ جانے کے بعد انھوں نے ساقی فاروقی سے اصلاح لی۔ اس لحاظ سے انھوں نے زیرِ نظر شعری مجموعے میں دونوں کو ہی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ انھوں نے ساقی فاروقی کو یاد کرتے ہوئے کہا:

میں اتفاق سے کل رات جس مکان میں تھا
لیکن اس کا دل کسی اور ہی کے دھیان میں تھا
ہمیں بھی بات بدلتے ہوئے نہ دیر لگی
غزل میں جو بھی کہا آپ کی شان میں تھا

اسی طرح اپنے والد مظفر حنفی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قصہ اتنا پرانا تو ہے نہیں
کیا کیجیے کہ اب وہ زمانہ تو ہے نہیں
اپنی انا سے ہم نے سمجھوتا کر لیا
جیسے ہمیں کسی کو منانا تو ہے نہیں

بہر کیف! پرویز مظفر نے زیرِ نظر مجموعے میں متفرق نظمیں اور غزلیں شامل کی ہیں جن میں انھوں نے اپنے دلی جذبات اور ذاتی تجربات کو پیش کیا۔ وہ 1993 سے برمنگھم (برطانیہ) میں مقیم ہیں۔ برطانیہ کے ادب و کلچر میں جس انداز میں انھوں نے اُردو کا پرچم بلند کیا ہوا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ پرویز مظفر کا شمار ہندستان کے اُن چند ادیبوں میں ہوتا ہے جو دیارِ غیر میں بیٹھ کر وطنِ عزیز اور اُردو زبان و ادب کی تعمیر و فروغ میں اپنا کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ برطانیہ میں جو ہندستانی ادیب مقیم ہیں ان میں پرویز مظفر کی شناخت ایک درخشاں ستارے کی مانند ہے۔ کتاب کے فلیپ پر ظفر اقبال ظفر نے جامع انداز میں پرویز مظفر کے کام پر روشنی ڈالی ہے۔ دیباچہ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے رقم کیا ہے اور توشیحی نظم فرحت حسین خوش دل نے لکھی ہے۔ کتاب فیروز مظفر کے نام معنون ہے۔ امید قوی ہے کہ پرویز مظفر دیارِ غیر میں یوں ہی اپنا ادبی سفر جاری و ساری رکھیں گے۔ ◆◆

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین و مقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من و تو (تحقیقی و تنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات و مضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق و توازن	ڈاکٹر نریش	250/-

کلامِ شبلی کے منظوم تراجم (بقیہ صفحہ 2 سے آگے)

کی فارسی نشریات سے وابستہ رہے۔ ملازمت کے ساتھ مسلسل دادِ سخن دیتے رہے۔ دو شعری مجموعے ’روحِ سخن‘ اور ’محشرِ خیال‘ شائع ہوئے اور اردو اکادمی دہلی نے دونوں کو اپنے انعامات سے نوازا۔

ڈاکٹر احمد علی برقی کو نہ صرف اردو شاعری بلکہ فارسی شاعری سے بھی بے انتہا لگاؤ تھا۔ علامہ شبلی کی شاعری سے تو انھیں جذباتی لگاؤ تھا، چناں چہ ان کی کئی فارسی غزلوں کا منظوم اردو ترجمہ کرکے شائع کیا۔ حق تو یہ ہے کہ ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایک فارسی غزل کا منظوم اردو ترجمہ بطورِ نمونہ پیش کیا ہے:

(1)

من کہ در سینہ دلی دارم وشیدا چہ کنم
میل با لالہ رخاں گر نہ کنم تا چہ کنم
ہے جو سینے میں دل شیدا بتا میں کیا کروں
گر حسینوں سے نہ رکھوں رابطہ میں کیا کروں

(2)

من نہ آنم کہ بہ ہر شیوۂ دل از دست دہم
لیک با آں نگہ حوصلہ فرسا چہ کنم
وہ نہیں ہوں ہر ادا پر اس کی دے دوں اپنی جان
حوصلہ فرسا نگاہوں کا بتا میں کیا کروں

(3)

ہست چہل سال کہ بیہودہ نگہ داشتمس
گرنہ بر سنگ زنم شیشہ تقویٰ چہ کنم
پاس ہو بیکار میرے جب وہ چالیس سال سے
گر نہ ٹوٹے شیشۂ تقویٰ، بتا میں کیا کروں

(4)

مایہ تقویٰ سی سالہ فراہم شدہ است
ارمغانش بہ نگاری بدہم یا چہ کنم
تیس سالہ تقویٰ کا سامان جب موجود ہو
گر نہ دوں معشوق کو تحفہ بتا میں کیا کروں

(5)

شاہد و بادہ وطرف چمن و جوشِ بہار
شبلیا خود تو بفرما کہ بہ ایں ہا چہ کنم
ہو جو گلشن میں شراب و شاہد و جوشِ بہار
ایسے میں شبلی تو ہی اس کا، بتا میں کیا کروں

(6 نومبر 2022)

ان منظوم تراجم سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی کس درجہ بلند پایہ شاعر تھے اور کس درجہ عمدہ منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ان تینوں مترجمین نے اگرچہ پوری دلچسپی لی اور علامہ شبلی کی غزلوں کے منظوم اردو تراجم کیے مگر یہ علامہ شبلی کے کلام کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
شائستہ منزل، 641، پورہ غلامی، عقب آواس وکاس، اعظم گڑھ-276001، یوپی
E-mail: azmi408@gmail.com, Mob. 9838573645

زبان کے لیے قواعد ضروری کیوں؟ (بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اور آگے چل کر یہی نظریہ لاطینی قواعد کی بنیاد بنا، جس کے اثرات قرونِ وسطیٰ سے لے کر نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) تک یورپ کی تمام علمی روایتوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یوں مغربی دنیا میں قواعد کی ابتدا فلسفے سے ہوئی، مگر رفتہ رفتہ یہ زبان کے ایک خودمختار اور منظّم مطالعے میں تبدیل ہوگئی۔ ایک ایسا سفر جو افلاطون کے تصورات سے شروع ہوکر ڈائیونیسئس کی کتاب میں عملی صورت اختیار کرتا ہے۔

قواعد کی سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت ابلاغ کی وضاحت ہے۔ زبان کا مقصد خیالات، احساسات اور تجربات کی منتقلی ہے، لیکن اگر اس منتقلی میں ابہام درآئے تو معنی مسخ اور بات نامکمل رہتی ہے۔ قواعد اس ابہام کو رفع کرتے ہیں، کیوں کہ یہ جملے کی نحوی ترتیب (Syntax)، فاعل ومفعول کا تعین، اور فعل کے صیغے کے ذریعے بات کو واضح کرتے ہیں۔

مثلاً: یہ جملہ ’کتا آدمی کو کاٹتا ہے‘ اور ’آدمی کتے کو کاٹتا ہے‘ بہ ظاہر ایک ہی جملے پر مشتمل ہے، مگر معنی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ فرق دراصل قواعد کے نظام سے واضح ہوتا ہے۔ اگر یہ نظام نہ ہو تو زبان ایک شور انگیز ہجوم بن جائے، جہاں الفاظ تو ہوں گے مگر ان کا مفہوم مفقود ہو جائے گا۔ درحقیقت قواعد زبان کے لیے وہ آئینہ ہے جس میں کسی بھی خیال کی صورت صاف جھلکتی ہے۔ اس کے بغیر بات چاہے کتنی بھی سچی ہو، مضبوط ہو، سمجھ میں نہیں آتی۔

قواعد زبان کو ایک منظّم نظام (System) فراہم کرتے ہیں، جو اس کے تمام اجزا کو ایک باہمی ربط میں جوڑتا ہے۔ مشہور سوئس ماہرِ لسانیات فریڈینینڈ ڈی سوسور (Ferdinand de Saussure, 1857-1913) نے اپنی کتاب ’کورس اِن جنرل لِنگوِسٹکس‘ (Course in General Linguistics) میں زبان کو ایک اجتماعی معاشرتی ادارہ (Social Institution) قرار دیا، اور ’زبان‘ (Langue) اور ’لسانی رویے‘ (Parole) کے فرق سے زبان کے باطنی ڈھانچے کو واضح کیا۔

زبان (Langue) سے مراد زبان کا وہ اجتماعی اور منظّم نظام ہے جو سماج کے افراد کے مابین مشترک ہے، جب کہ لسانی رویہ (Parole) کسی فرد کا ذاتی اظہار ہے۔ سوسور کے نزدیک اگر زبان (Langue) کا اصولی نظام ختم ہو جائے تو لسانی رویّہ (Parole) بھی بے معنی ہو جائے، کیوں کہ الفاظ اپنی قدر اور معنی صرف اسی وقت پاتے ہیں جب وہ ایک ساختی رشتے میں بندھے ہوں۔ سوسور کے مطابق: ”زبان ایک ایسا نظام ہے جس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، اور ان کی قدر و قیمت صرف اسی باہمی تعلق سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ قواعد ہی ہیں جو اس ربط کو قائم رکھتے ہیں۔“ قواعد زبان کو صرف ظاہری ترتیب نہیں دیتے بلکہ اس کے وجود کو اندر سے سہارا دیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو قواعد حقیقت میں زبان کے لیے وہ بنیاد ہیں جن پر زبان کی پوری عمارت کھڑی ہے۔

قواعد کی سب سے حیرت انگیز خصوصیت اس کی تخلیقی وسعت ہے۔ جدید لسانیات کے عظیم مفکر نوم چومسکی (Noam Chomsky) نے اپنی مشہور کتاب ’سِنٹیکٹک سٹرکچرز‘ (Syntactic Structures) میں ’تولیدی گرامر‘ (Generative Grammer) کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق انسان کے ذہن میں Universal Grammar یعنی عالمگیر لسانی اصول فطری طور پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ وہ ذہنی نظام ہے جو انسان کو محدود قواعد کے ذریعے لامحدود جملے بنانے کی صلاحیت دیتا ہے۔ اور یہی تخلیقی قوت انسان کو محض بولنے والا نہیں بلکہ معنی خیز تخلیق کرنے والا وجود بناتی ہے۔

قواعد اور ادبی حسن

ادب درحقیقت زبان کا جمالیاتی ارتقا ہے۔ وہ مقام جہاں لفظ اپنے عام معنوں سے بلند ہوکر تاثر، آہنگ اور فن میں ڈھل جاتا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو اس حسن کا ظہور اچانک نہیں ہوتا۔ یہ قواعد کی نازک زمین سے پھوٹتا ہے۔ ادب میں قواعد کی حیثیت جسم میں خون کی سی ہے۔ جو بہتا رہے تو زندگی، رک جائے تو جمود۔ ادب کی دنیا میں قواعد دو متضاد مگر ہم آہنگ کردار ادا کرتے ہیں: ایک طرف وہ نظم وضبط اور آہنگ پیدا کرتے ہیں، دوسری طرف تخلیق کار کو اس نظم سے بغاوت کی اجازت بھی دیتے ہیں تاکہ نئی معنوی جہتیں پیدا ہوسکیں۔

1- نظم و ضبط اور آهنگ

ادب میں قواعد کی موجودگی زبان کو صرف درستی نہیں بلکہ حسنِ ترتیب اور آہنگ عطا کرتی ہے۔ ہر جملہ، ہر مصرع اور ہر ترکیب اپنی مخصوص نحوی ساخت کے ذریعے اثر پیدا کرتی ہے۔ شاعری ہو یا نثر، اس کے حسن کی بنیاد توازن، تسلسل اور تناسب پر ہے، جو قواعد ہی کی مرہونِ منت ہیں۔

شاعری میں اگرچہ عروض اور بحر فنی قواعد ہیں، مگر ان کی جڑیں لسانی قواعد سے جدا نہیں۔ لفظ کی ترتیب، ضمیر کی مطابقت، صیغے کی ہم آہنگی، یہ سب وہ قیمتی عناصر ہیں جو کسی عبارت کو فکری ومعنوی گہرائی کے ساتھ ساتھ صوتی نغمگی بھی فراہم کرتے ہیں۔

قواعد کی پیروی دراصل زبان کے احترام کی علامت ہے۔ وہ ادیب جو زبان کے نظام کو جانتا ہے، وہ اس کے اندر حسن پیدا کرسکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ایک ماہر مصور رنگوں کے نظم کو سمجھ کر ہی تجرید میں نئی جہتیں پیدا کرتا ہے۔

2- غیر رسمی استعمال اور انحراف (Deviance)

جب ایک ادیب قواعد کے دائرے سے باہر قدم رکھتا ہے تو وہ دراصل بغاوت نہیں، بلکہ تخلیق کر رہا ہوتا ہے۔ یہی انحراف، جب فنکارانہ شعور کے ساتھ کیا جائے تو ادب میں نئی معنوی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً شاعری میں جملے کی ساخت توڑ دینا، لفظ کو غیر مانوس جگہ رکھنا، یا رسمی قاعدے کو الٹ دینا۔ یہ سب فنی روایت شکنی یا تخلیقی بغاوت (Artistic Deviance) کی صورتیں ہیں۔

دراصل یہ انحراف قاری کے ذہن میں سوالیہ نشان پیدا کرتا ہے، جو اسے سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور الفاظ کے معنی کو وسعت دیتا ہے۔ لیکن یہ جمالیاتی بغاوت اسی وقت بامعنی ہوتی ہے جب ادیب یا شاعر کو اصل قواعد پر مکمل دسترس ہو۔

اگر کسی ادیب یا شاعر کو قواعد کا مکمل علم نہ ہو، تو اس کی خلاف ورزی ’فن‘ نہیں، بلکہ ادبی بدنظمی (Disorder) بن جاتی ہے۔ جو انحراف نہیں بلکہ افراتفری ہے۔ ادب میں انحراف ایک باوقار نافرمانی ہے، مگر یہ نافرمانی تبھی قابلِ قبول اور معتبر ہوتی ہے جب وہ علم، شعور اور مقصد کے ساتھ کی جائے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ زبان کے قواعد محض خشک اور روایتی اصول نہیں، بلکہ زبان کی روح ہیں۔ یہ وہ نادیدہ معمار ہیں جو ہر لفظ کو دوسرے لفظ سے جوڑ کر ایک مکمل سوچ کی عمارت قائم کرتا ہے، ایک ایسا ڈھانچہ جس کے بغیر زبان اپنی شناخت کھو دیتی ہے اور اس کی حیثیت معدومی کا شکار ہو جاتی ہے۔

تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو قواعد ہر زبان کے لیے نہ صرف بقا اور معیار کی ضمانت ہیں، بلکہ اس کی ترقی، تخلیق، اور دیگر زبانوں کے ساتھ ہم پلہ ہونے کی شرط بھی ہیں۔ قواعد کے بغیر زبان کے الفاظ منتشر ہو جاتے ہیں، اس کا ادبی وسائنسی ذخیرہ ضائع ہو جاتا ہے، اور نسل در نسل منتقلی ممکن نہیں رہتی۔ چناں چہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قواعد زبان کو زندگی، نظام اور ابدی پن عطا کرتے ہیں۔ یہ وہ قوت ہے جو زبان کو محض اظہار نہیں رہنے دیتی، بلکہ اسے ایک زندہ، ترقی پذیر اور فکری اعتبار سے فعال وجود بناتی ہے۔ بغیر قواعد کے زبان نہ تو اپنے ماضی کے خزانے کو محفوظ رکھ سکتی ہے، نہ موجودہ نسلوں میں معنوی رابطہ قائم رکھ سکتی ہے، اور نہ مستقبل کے خیالات کو تخلیق کرنے کے قابل ہی رہتی ہے۔ قواعد ہی زبان کی زندگی کا ضامن، اس کی پہچان کا محافظ، اور اس کے مستقبل کی رہنمائی کرنے والا نسخہ کیمیا ہے۔

محمد بلال رؤف
کیڈٹ کالج پیٹارو، سندھ حیدرآباد
E-mail: bilal.rauf@gmail.com
Phone No. : 03112422216

زبان کے لیے قواعد ضروری کیوں؟

محمد بلال رؤف

زبان انسانی تہذیب کی سب سے عظیم اور زندہ تخلیق ہے۔ اسی کی بدولت انسان خود کو حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔ زبان کے ذریعے ہی انسان نے اپنے احساسات، خیالات، تجربات، مشاہدات اور خواب دوسروں تک منتقل کیے، تہذیب وتمدن کی بنیاد رکھی اور تاریخ کو دوام بخشا۔ دراصل زبان محض الفاظ اور آوازوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ یہ انسانی فکر، اجتماعی شعور، ثقافتی ورثے اور قومی شناخت کا آئینہ ہے۔ ہر قوم کی زبان میں اس کی روح، طرزِ احساس اور طرزِ فکر پوشیدہ ہوتی ہے، لیکن زبان کی یہ معنوی، فکری اور تہذیبی قوت اس وقت تک بامعنی نہیں بن سکتی جب تک اسے قواعد کا سہارا حاصل نہ ہو۔ قواعد دراصل زبان کے وہ اصول وضوابط ہیں جو الفاظ کے استعمال، ترتیب، معنی اور ربط کو منظّم کرتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں، قواعد زبان کی ساخت (Structure) اور نظام (System) کو برقرار رکھتے ہیں، تاکہ بات چیت واضح، بامقصد اور قابلِ فہم ہو۔

کچھ وقت کے لیے زبان کو ایک میکانیکی گھڑی تصور کریں۔ الفاظ اور جملے گھڑی کے مختلف پہیے، چھوٹے اور بڑے گیئر (Gears) ہیں جو بظاہر آزاد حرکت کررہے ہیں، مگر جب کوئی چیز درست ترتیب میں نہ ہو تو گھڑی صحیح وقت نہیں دکھاتی۔ قواعد وہ mechanism Precise اور محور ہیں جو ہر پہیے کو اپنی جگہ اور درست رفتار پر حرکت کرنے پر مجبور کرتے ہیں، ورنہ سب بے ربط ہوجاتا ہے اور گھڑی کی شکل اور فنکشن ختم ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح، قواعد کے بغیر زبان کے الفاظ صرف بکھرے ہوئے حصے رہ جاتے ہیں، اور جملہ، بیان یا خیال اپنی مکمل صورت اور معنی نہیں دے پاتا۔ قواعد کے بغیر زبان ایک بے ربط، غیر منظّم آوازوں کا ہجوم بن کر رہ جاتی ہے، جہاں ہر شخص اپنی مرضی سے جملے گھڑتا ہے اور مفہوم کا رشتہ بکھر جاتا ہے۔ یوں زبان، جو فہم وابلاغ کا وسیلہ ہے، خود افہام وتفہیم کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

قواعد کی بدولت ہی زبان میں وضاحت، روانی اور ترتیب پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہمیں درست تلفظ، درست ترکیب اور صحیح معنی کے اظہار کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاسکتا ہے کہ قواعد، زبان کی ریڑھ کی ہڈی اور اس کے حسن وبقا کا ضامن ہیں۔ وہ خاموش معمار جو ہر جملے کے پیچھے معنی کی عمارت کو استوار کرتا ہے۔ قواعد کی تدوین کا عمل دراصل زبان کے ارتقا کا وہ مرحلہ ہے جو زبان کے شعور سے جڑا ہوتا ہے۔ ابتدا میں زبان فطری طور پر وجود میں آتی ہے۔ لوگ اپنے جذبات، احساسات اور ضروریات کے اظہار کے لیے الفاظ گھڑتے ہیں، بولتے ہیں، اور ان کی یہی بول چال رفتہ رفتہ ایک زبان کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اس مرحلے میں کوئی ضابطہ، کوئی اصول یا کوئی منظّم ڈھانچہ موجود نہیں ہوتا۔ زبان بس بولی جاتی ہے، جیسے دریا اپنے راستے خود بناتے ہوئے، کسی منصوبے یا قواعد کے بغیر بہتا رہتا ہے، لیکن جب اہلِ زبان کو یہ ڈر محسوس ہونے لگتا ہے کہ زبان کی بول چال میں فرق آنے لگا ہے، یا زبان میں بگاڑ، ابہام اور تغیر پیدا ہونے کا امکان ہے، تب وہ اس کے درست استعمال اور حفاظت کے لیے تگ ودو کرتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب زبان باقاعدہ ایک علم کی صورت اختیار کرتی ہے۔ قواعد کی تدوین دراصل اسی شعوری احساس کا نتیجہ ہے۔ جب انسان محض بولنے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ اپنی زبان کے اندرونی نظام کو سمجھنے اور منظّم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

قواعد کا ظہور زبان کے استقرائی مطالعے (Inductive Study) سے ہوتا ہے۔ یعنی پہلے زبان بولی جاتی ہے، پھر ماہرینِ لسانیات واہلِ علم اس کے بولنے کے طریقے، جملوں کی تراکیب، الفاظ کی ترتیب اور معنی کے ربط کو مشاہدے کی روشنی میں سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اہلِ زبان کن صورتوں کو درست سمجھتے ہیں، اور انھی فطری اصولوں کو ضابطے کی شکل دیتے ہیں۔ یوں قواعد کسی کے گھڑے ہوئے قوانین نہیں، بلکہ زبان کے قدرتی استعمال کی علمی تشکیل ہیں۔

تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جب زبان وسعت پاکر تعلیم، مذہب، ادب یا سیاست کا ذریعہ بنتی ہے، تب اس کے تحفظ کے لیے قواعد کا وجود لازمی ہوجاتا ہے۔ جیسے عربی زبان میں قرآنِ مجید کے بعد صرف ونحو کی تدوین نے زبان کی فصاحت وبلاغت کو محفوظ رکھا، اسی طرح اردو میں بھی جب مختلف زبانوں کے اثرات نے اس کے مزاج کو متاثر کیا، تو ماہرینِ لسانیات نے اس کے اصول مرتب کیے تاکہ زبان کا حسن اور ربط باقی رہے۔ دراصل قواعد کی تدوین زبان کی زندگی میں خود آگاہی کا وہ لمحہ ہے، جب زبان اپنے آپ کو پہچاننے، سمجھنے اور جاننے لگتی ہے۔

اگر قواعد نویسی کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی سب سے منظّم، قدیم اور سائنسی روایت ہمیں برصغیر کی علمی سرزمین ہندستان میں ملتی ہے۔ سنسکرت کے قابلِ احترام ماہرِ لسانیات پانینی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے پانچویں صدی قبلِ مسیح میں اپنی عظیم تصنیف 'اشٹا دھیائی' (Astadhyai) مرتب کی اور اس کے ذریعے زبان کو ایک ایسے منظّم ضابطے میں ترتیب دیا کہ جس کی مثال ان کے بعد پوری لسانیات کی تاریخ میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کا یہ کام مشرقی ومغربی لسانی روایت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پانینی کا بنیادی مقصد وید مقدس (سنسکرت کی خالصتاً مذہبی کتب) کی فصیح صورت کو محفوظ رکھنا تھا، تاکہ زبان کی تقدیس اور اس کی معنوی پاکیزگی برقرار رہے، لیکن ان کی کاوش محض مذہبی جذبے تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایک حیرت انگیز علمی شعور اور منطقی نظام بھی کارفرما تھا۔ 'اشٹا دھیائی' تقریباً چار ہزار سُوتر (یعنی قواعدی اصول) پر مشتمل ہے، جس میں صوتیات (Phonetics)، صرف (Morphology)، اشتقاق (Derivation) اور نحو (Syntax) کے انتہائی باریک پہلوؤں کو نہایت منظّم اور منطقی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

پانینی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس نے زبان کے قواعد کو محض وضاحتی (Descriptive) انداز میں پیش نہیں کیا، بلکہ ایک تولیدی (Generative) نظام کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ ایک ایسا نظام جو محدود اصولوں سے لامحدود درست جملے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کے یہ اصول نہ صرف سنسکرت بلکہ عمومی طور پر انسانی زبان کے فطری ڈھانچے کو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد فراہم کرتے ہیں۔ اسی بنیاد پر جدید لسانیات کے بانی نوم چامسکی (Noam Chomsky) تک پانینی کے کام سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی "Generative Grammar" کی بنیاد بھی اسی تصور پر قائم ہے کہ زبان ایک باقاعدہ، قاعدہ ساز نظام ہے جس کے اندر محدود قواعد سے لامحدود اظہار کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔

مغرب میں بنیادی طور پر قواعد نویسی کی ابتدا یونانی فلسفیوں کے فکری مباحث سے ہوئی۔ آغاز میں زبان کو محض اظہارِ خیال کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ منطق اور فلسفے کا مظہر بھی سمجھا جاتا تھا۔ یونانی مفکرین کے نزدیک زبان، فکر کا آئینہ اور اس کی درستی دراصل انسانی عقل کی درستی سے تعبیر کی جاتی تھی۔ چناں چہ قواعد کا مقصد زبان کی فطری ساخت کو سمجھنا نہیں بلکہ اس کی درستی (Prescriptivism) کو برقرار رکھنا اور اسے منطقی اصولوں کے تابع بنانا تھا۔

یونانی فلسفیوں میں افلاطون اور ارسطو نے زبان کے فکری اور منطقی پہلوؤں پر گہرے مباحث کیے۔ افلاطون نے زبان کو تصورات کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا، جب کہ ارسطو نے الفاظ، جملوں اور معنی کے تعلق کو منطق کے سانچے میں پرکھا۔ انھی مباحث سے اجزائے کلام (of Parts Speech) کی ابتدائی تقسیم سامنے آئی، جس نے بعد کی لسانی تحقیق کی بنیاد رکھی۔

اس فکری سلسلے کی باقاعدہ علمی تشکیل پہلی صدی قبلِ مسیح میں ہوئی، جب یونانی ماہرِ لسانیات ڈائیونیسئس تھراکس (Dionysius Thrax) نے اپنی مشہور تصنیف 'ٹیکنِ گراماٹیکے' Téchne Grammatike (The Art of Grammer) تحریر کی۔ یہ کتاب مغربی دنیا کی سب سے پہلی منظّم گرامر سمجھی جاتی ہے۔ اس میں زبان کے بنیادی اصولوں کو واضح کیا گیا اور آٹھ اجزائے کلام اسم، فعل، ضمیر، حرف، حرفِ ربط، صفت، ظرف، اور حرفِ ندا کی درجہ بندی کی گئی، جو بعد میں لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں کے قواعد کا نمونہ بنی۔

'ٹیکنِ گراماٹیکے' نے مغربی لسانی روایت کو یہ تصور دیا کہ زبان ایک منطقی نظام ہے جسے اصولوں، اقسام اور ترکیبوں کی ...

(بقیہ صفحہ 7 پر)

مدیر : **اطہر فاروقی**
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)